حکیم ابوالقاسم فردوسی

آصف نعیم صدیقی
لیکچرار شعبہ فارسی
کشمیر یونیورسٹی سرینگر

عہد غزنوی کی برگزیدہ شخصیت حکیم ابوالقاسم فردوسی جسے فارسی رزم نگاری کی تاریخ کا سرآغاز اور سب سے اہم نام قرار دیا جاتا ہے اس لحاظ سے بدقسمت ہے کہ اگرچہ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں افسانہ زیادہ ہے اور صحیح معلومات کم۔ محققین کریں بھی تو کیا کریں جب تک شاھنامہ کا صحیح اور قریب العہد نسخہ دستیاب نہ ہو اس وقت تک اس دھند کا چھٹنا بعید از امکان نہیں تو عملاً دشوار ضرور ہے۔ ہندوستانی محققین میں حافظ محمود شیرانی نے فردوسی پر اپنے مقالوں میں فردوسی کے مذہب، شاھنامہ کی ابتدا ہجو کی حقیقت پر مسکت انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ ان کے نتائج بڑی حد تک صحیح معلومات کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔

شاعر کی کنیت ابوالقاسم اور تخلص فردوسی ہے۔ اس کے اصل نام کے سلسلے میں مختلف تذکرہ نگاروں کے مختلف بیانات ہیں۔ ترجمۃ البنداری میں فردوسی کا نام منصور بن حسن بتایا گیا ہے۔ تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی۔ دولت شاہ کے تذکرۃ الشعرا اور آتش کدہ آذر میں حسن بن اسحٰق اور مجمع الفصحاء ہدایت میں حسن ابن اسحاق بن شرفشاہ محمد بن منصور بن فخرالدین احمد بن حکیم مولانا فرخ درج ہے لیکن چونکہ البنداری کو سب پر تقدم ہے اس لئے ان کا بتایا ہوا نام ہی زیادہ صحیح سمجھنا چاہیئے۔ نظامی عروضی نے قریۂ باژ کو فردوسی کا مولد لکھا ہے اور دولت شاہ سمرقندی نے قریۂ رزان بتایا ہے لیکن عروضی کے قول کو قدامت زمان کی بنا پر زیادہ درست سمجھنا چاہیئے۔ فردوسی کا سال ولادت بھی معلوم نہیں لیکن چونکہ فردوسی نے

شاہنامہ میں بعض مواقع پر اپنی عمر کا ذکر کیا ہے چنانچہ اس کی سال ولادت کا اندازہ لگانے میں اس کے یہ بیانات مددگار ثابت ہو سکتے ہیں مثلاً سلطان محمود کے سال جلوس (۳۸۷) پر وہ اپنی عمر اٹھاون (۵۸) سال بتاتا ہے اب اسکو بنیاد بنا کر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فردوسی ۳۲۹ھ یا ۳۳۰ھ میں پیدا ہوا ہوگا۔

فردوسی ایک زمیندار (دہقان) گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ بقول نظامی عروضی، سمرقندی اپنے وطن "باژ" میں شوکت و شکوہ کے ساتھ عیش اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن عمر کے آخری برسوں میں بے فکری اور خوش حالی باقی نہ رہ سکی۔ شاید اس نے اپنی ساری رقم اور جایداد شاہنامہ کے ماخذ کی فراہمی اور تیاری میں صرف کر دی تھی۔ فردوسی نے کس سے تلامذہ کیا اور کہاں علم حاصل کیا اس کا بھی کوئی علم نہیں لیکن اتنا ضرور محقق ہے کہ وہ عربی اور فارسی ادب و زبان پر دستگاہ کامل رکھتا تھا۔

شاہنامہ کی ابتدا۔

ساسانی بادشاہوں کے آخری برسوں میں ایران قدیم کی تاریخ کو قلمبند کروانے کا ایک رجحان پیدا ہو چکا تھا چنانچہ پہلوی زبان میں کچھ تاریخیں مرتب کی گئیں جن میں سے خدای نامہ یا بادشاہ نامہ بھی ایک ہے۔ عباسیوں کے دور میں جب ایرانی قومیت کی تحریک شروع ہوئی۔ ان دنوں ابن مقفع (مترجم کلیلہ و دمنہ) جو ایرانی نژاد تھا اور اسی زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوا تھا اس نے خدائی نامہ پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کا یہ ترجمہ بعد میں متعدد ایرانی تاریخوں اور شاہناموں کا ماخذ قرار پایا۔ انھیں شاہناموں میں سے ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی کا شاہنامہ بھی ہے۔ شاہنامہ منصور کے زیر اثر صاحب طبع ایرانی اس کو نظم کرنے پر مایل ہو گئے جس میں دقیقی بھی شامل ہے۔ افسوس کہ موت نے دقیقی کے اس عزم کو مکمل نہ ہونے دیا اور بعد میں یہ کام فردوسی کے ہاتھوں انجام پایا۔

یکی نامہ بُد از گہ باستان | فراواں بدو اندروں داستان
پراگندہ در دست ہر موبدی | ازاو بہرہ بردہ ہر بخردی
یکی پہلوان بود دھقان نژاد | دلیر و بزرگ و خردمند راد

(ابومنصور)

پژوہندۂ روزگار نخست | گذشتہ سخنہا ہمہ باز جست
ز ہر کشوری موبدی سالخورد | بیاورد وایں نامہ را گرد کرد
چو ایں دفتر از داستانہا بسی | ہمی خواند خواننده بر ہر کسی
جہاں دل نہادہ بر ایں داستان | ہماں بخردان و ہماں راستاں
جوانی بیامد گشادہ زبان | سخن گوئی و خوش طبع و روشن رواں

(دقیقی)

بنظم آرم این نامہ را گفت من | ازاو شادماں شد دل انجمن
جوانیش را خوی بد یار بود | ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
براو تاختن کرد ناگاہ مرگ | نہادش بسر بر یکی تیرہ ترگ
یکایک ازاو بخت برگشتہ شد | بدست یکی بندہ برکشتہ شد
ز گشتاسب و ارجاسپ بیتی ہزار | بگفت و سر آمد براو روزگار

فردوسی نے جس وقت شاہنامے کا عزم کیا سلطان محمود اس وقت تک بر سرِ اقتدار نہ آیا تھا لہٰذا شاہنامہ کو نظم کروانے اور اسکی تنظیم و ترتیب میں علی رغم داستان سلطان محمود کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف فردوسی کی رغبت اور تاریخ ایران سے دلچسپی سے ہے۔ ہاں اس ضمن میں وہ اپنے ان مربیوں اور دوستوں کا ضرور ممنت کش ہے جنہیں تاریخ ایران سے دلچسپی تھی اور جو یہ چاہتے تھے کہ ایران کی اس تاریخ کو نظم کے قالب میں ڈھال کر بقائے دوام حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاہنامہ کے ختم ہوتے ہوتے سلطان

محمود جب تخت پر بیٹھا اور اس کا شکوہ و جلال سارے ملک میں پھیلنے لگا تو دستور زمانہ کے مطابق فردوسی کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کیوں نہ وہ ایسے عظیم کارنامے کو محمود جیسے عظیم کر و فر والے بادشاہ کے نام معنون کردے اور اس محنت و جانکاہی کے عوض کچھ صلہ پالے مگر گو یہاں اس کی توقعات اس کے حسب تقاضا پوری نہ ہوئیں۔

ایسا لگتا ہے کہ فردوسی ۳۶۷-۳۶۹ میں یعنی جب دقیقی کا قتل ہوا تھا۔ بعض منفرد داستانوں کو نظم کرنے کا کام شروع کر چکا تھا۔ ان منفرد داستانوں میں سب سے پہلی شاید داستان "داستان بیژن و گرازان" ہے۔ داستان بیژن و گرازان یا رزم بیژن و گرازان یا داستانِ بیژن و منیژہ اس وقت لوگوں میں سب سے زیادہ مقبول داستان تھی۔ یہاں تک کہ اس کی تصاویر بھی لوگ اپنے گھروں میں دیواروں پر نصب کیا کرتے تھے داستان بیژن و منیژہ کے آغاز میں مقدمہ کے اشعار اور خود اس داستان میں فردوسی کے اسلوب کی عدم پختگی اور بعض الفاظ کی ایسی شکلیں جو بعد میں خود شاہنامہ میں متروک نظر آتی ہیں مثلاً الف اطلاقی کا استعمال یہ سب ایسے دلایل ہیں کہ داستان بیژن و منیژہ شاہنامہ کی ابتدائی اور شاید پہلی داستان ہے داستان بیژن و منیژہ نظم کرنے کے بعد خود اس پر جب اس کے پوشیدہ جوہر عیاں ہوتے اور اس کے دوستوں نے جو اس کی ہمت افزائی کی اور سب سے بڑھ کر دقیقی کے گرشاسپ نامہ سے اسے جو ہمت اور تشویق ملی اس نے مختلف ماخذ علی الخصوص شاہنامہ ابو منصوری اور سرو آزاد اور دیگر راویوں کی مدد سے غالباً ۳۷۰ اور ۳۷۱ میں اس نے ایران قدیم کی داستانوں اور تاریخ کو ایک مدون اور مرتب کتاب کی شکل میں پیش کرنے کا قصد کر ڈالا۔

شاہنامہ کا اختتام ! ختم شاہنامہ کے دور میں پہلا نسخہ ۳۸۴ میں مکمل ہوا اور دوسرا ۴۰۱ یا ۴۰۲ میں تکمیل شاہنامہ کے لیے ۳۵ سال کی مدت کا تعلق دوسری تاریخ سے ہے پہلا نسخہ دوسرے نسخے سے نسبتاً کچھ مختصر تھا اور سلطان محمود کی تخت نشینی سے پہلے مکمل ہو گیا تھا پہلا نسخہ اس نے ۳۸۴ میں مکمل تو کر لیا تھا مگر ابھی وہ اپنے اس کام سے مطمئن نہ تھا اور چاہتا تھا

کہ اپنے اس کارنامے میں ضروری اضافے بھی کرے اور لازمی تبدیلیاں بھی۔ اسے ایک ایسے حاکم اور مربی کی بھی تلاش تھی جو انتساب شاہنامہ کے شایان شان ہو۔ سلطان محمود جب ۳۸۸ میں تخت نشین ہوا اور جب اس کے اقتدار کا سورج بام عروج پر چڑھنے لگا تو فردوسی کو تقدیم کتاب کے لئے اسی کی ذات سب سے زیادہ موزوں اور مناسب نظر آئی۔ اتفاق سے ۳۹۴ یا ۳۹۵ میں فضل بن احمد یا نصر بن نامر الدین سبکتگین کے توسط سے فردوسی کو دربار تک رسائی بھی حاصل ہو گئی۔ اس امر کے بعد اس نے نظر ثانی کا کام اور گہرائی سے شروع کر دیا ہے اور چوں کہ اس نے طے کر لیا تھا کہ اسے اپنا یہ کارنامہ سلطان محمود کو ہی سونپنا ہے لہذا مناسب مقامات پر وہ سلطان محمود کی مدح بھی شامل کرتا گیا۔ مدح کے ساتھ ساتھ اپنی نیاز مندی اور تنگدستی کی شکایات بھی سناتا رہا اور اس تمنا کا اظہار بھی کرتا رہا کہ اے کاش بادشاہ کی بلند ہمت میرے اس کارنامے کو دست برد زمانہ سے بچا لے۔ دربار میں رسائی حاصل ہونے کے بعد پانچ سال کی مدت میں یعنی ۳۹۵ سے لے کر ۴۰۰ یا ۴۰۱ تک اس نے نظر ثانی کا کام مکمل کر ڈالا اور ۴۰۰ یا ۴۰۱ میں اس نے اپنے کارنامے کو دربار میں پیش کیا لیکن اب اسے فردوسی کی شومئی تقدیر ہی کہئے کہ دربار میں اس کا حامی فضل بن احمد معزول ہو چکا تھا اور اس کے نہ ہونے سے ہمارے شاعر کو دربار سے بے نیل مرام لوٹنا پڑا۔ یہیں پر یہ بھی واضح کر دینا مناسب ہے کہ بعض مستشرقین کا یہ خیال کہ فردوسی نے ۳۸۹ میں شاہنامہ مکمل کر کے پہلے اسے ابوبکر محمد حاکم خان لنجان کے نام تقدیم کیا تھا تاریخ کی رو سے غلط ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ BRITISH MUSLIM والے نسخے کے کے ایسے اشعار جو اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں الحاقی ہیں۔

یہ سوال کہ دربار سے مایوس ہو کر کیا فردوسی نے غصے اور بد دلی کی کیفیت میں سلطان محمود کی ہجو لکھ ڈالی ابھی تک تحقیق طلب موضوع ہے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ہجو لکھی تھی نہ یہ کہ ہجو نہیں لکھی لیکن یہ ضرور طے ہو چکا ہے کہ موجودہ ہجو یقیناً ایک گھڑی ہوئی چیز ہے جس میں گھڑنے والوں نے اپنے مقصد کے اشعار شاہنامہ کے مختلف حصوں سے لے لئے ہیں اور حسب ضرورت پر

کرنے کے لئے مزید اشعار بھی شامل کر دیتے ہیں۔ موجودہ ہجو اور اس سے ملحقہ بیشتر ساقط الاعتبار حکایات کی ذمہ داری بعد کے خاندان غزنوی کے مخالف تذکرہ نگاروں اور عہد بالسنقر میں شاہنامہ پر لکھے گئے دیباچہ کے سر ہے۔

وفات فردوسی

——— حمد اللہ مستوفی نے فردوسی کا سال وفات ۱۶ بتایا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی کی دی ہوئی تاریخ زیادہ درست معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں اپنی عمر کی طرف جو آخری اشارہ کیا ہے اس میں بتایا ہے کہ اب وہ ۸۰ سال کا ہو چکا ہے اور چونکہ وہ ۳۲۹ یا ۳۳۰ میں پیدا ہوا تھا اس اعتبار سے اس کا سال وفات ۴۱۱ ہی ہوگا۔ نظامی عروضی اور دیگر تذکروں کے مطابق فردوسی کے پسماندگان میں اس کی ایک لڑکی تھی لیکن شاہنامہ میں فردوسی اپنی بیٹی کا کوئی ذکر نہیں کرتا ہو سکتا ہے رہی ہی ہو اس لئے کہ شاہنامہ فردوسی کا زندگی نامہ تو ہے نہیں۔ شاہنامہ میں فردوسی ایک جگہ اپنے جواں سال بیٹے کی موت کا ذکر ضرور کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک لڑکا بھی تھا جو عین جوانی میں باپ کو داغ مفارقت دے گیا تھا

شاہنامہ کی ادبی و تاریخی اہمیت

شاہنامہ کو موضوع اور مطالعہ تاریخ کے اعتبار سے تین ادوار یا حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور

"آغاز کیومرث سے مرگ رستم تک"

یہ حصہ صرف اساطیری اور داستانوی ہے اس حصے میں آنے والے بیشتر اشخاص و کردار اوستا اور زرتشتیوں کی مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

دوسرا دور

زمان بہمن سے لیکر ساسانیوں کے آغاز تک

یہ حصہ اگرچہ تاریخی اساس رکھتا ہے لیکن اس میں بھی افسانویت غالب ہے

تیسرا دور

ساسانیوں کی تاریخ

تیسرا حصہ جو ساسانیوں کی سرگذشت سے متعلق ہے بلاشبہ تاریخ ہے اور اس میں افسانوی عنصر بہت کم ہے۔ شاہنامہ اگرچہ قدیم ایران کی داستان اور تاریخ ہے لیکن جا بجا فردوسی فلسفہ آفرینش، زندگی کی ناپائیداری، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ وغیرہ جیسے حکیمانہ اور فلسفیانہ موضوعات پر بھی اپنے گراں بہا عقاید کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ شاہنامہ میں بسا اوقات ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں فردوسی نے جنگ کے تخریبی پہلو کو پیش کر کے جنگ سے نفرت اور بد دلی کی طرف اشارے بھی کیے ہیں مثلاً ھفت خوان رستم سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جہاں رستم خود اپنے بارے میں یہ کہتا ہے

کہ آوارہ بدنشان رستمست	کہ از روز شادیش بہرہ کم است
ہمہ جاتی جنگ است میدان اوی	بیابان و کوہست بستان اوی
ہمہ جنگ باشیر و نر اژدھا	ز دیو و بیابان نیابد رھا
می و جام و بویا گل و مرغزار	نکردست بخشش مرا روزگار
ہمیشہ بجنگ نہنگ اندرم	دگر با پلنگان بجنگ اندرم

ارسطو کی پیش کردہ تعریف و مفہوم میں شاہنامہ کو رزمیہ ادب کہنا کس حد تک ممکن اور درست ہے یہ ایک سوال ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو شاہنامہ پر اس کا یہ قول ہی زیادہ صادق آتا ہے کہ منظوم طب اور تاریخ کو ہم شاعری نہیں کہہ سکتے۔ میرے خیال میں بھی شاہنامہ کی داستانوں میں تناسب اتحاد اور مکمل ہیئت کا وہ تصور نہیں ملتا جو رزمیہ کے لئے ضروری ہے۔ رزمیہ کی وضاحت میں ارسطو لکھتا ہے۔

" یہ بات صاف ہے کہ شاعرانہ نمائندگی کے اس اسلوب میں بھی جو متحد البحر اور بیانیہ ہوتا ہے پلاٹ کی تعبیر المیہ ہی کی طرح ڈراماتی اصولوں پہ ہوگی اس کا مرکزی موضوع ایک واحد عمل ہونا چاہیے

جو سالم اور مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ آغاز وسط اور انجام کا حامل ہو۔ اس طرح وہ اپنی پوری وحدت میں ایک زندہ وجود سے مشابہ ہوگا اور اس قسم کا لطف پیدا کرے گا جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ ساخت کے اعتبار سے یہ مورخانہ تحریروں سے مختلف ہوگا کیونکہ تاریخ بالضرورت ایک ہی عمل کو نہیں بلکہ ایک عہد کو اور اس عہد میں کسی فرد واحد یا بہت سے لوگوں کے ساتھ جو پیش آیا سب بیان کرتی ہے چاہیئے ان سب واقعات کا باہمی تعلق کتنا ہی تھوڑا ہو۔

ارسطو کی اصطلاح میں اس طرح تنقید کی اصطلاح میں شاہنامہ شاعری سے زیادہ منظوم تاریخ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیان و بدیع کی وہ تمام خصوصیات جو کسی ادبی شاہکار کا نشان اختصاصی قرار پاتی ہے شاہنامہ میں اپنی تکمیل شکل میں موجود ہیں گفتگو کی نہ گنجایش ہے نہ ضرورت مختصراً یوں سمجھیے کہ اختصار، ایجاز، مبالغہ شکوہ الفاظ، تخیل کی بلندی شعری برجستگی کی بہترین مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

فردوسی نے شاہنامے کو ایسی زبان میں نظم کیا ہے جو اس وقت اہل خراسان کے عوام کی زبان تھی۔ حتی الامکان اس کی یہی کوشش رہی ہے کہ وہ عربی تراکیب و الفاظ سے بچے اس کے اس سعی نے شاہنامہ کو آج ایک ایسا لغت نامہ بنا دیا ہے جس میں بہت سے متروک فارسی الاصل الفاظ محفوظ ہو گئے ہیں اور ہم ان سے آج اصطلاح سازی میں مدد لے سکتے ہیں ایسا نہیں کہ شاہنامہ میں عربی الفاظ بالکل نہ پائے جاتے ہوں۔ شاہنامہ میں عربی الفاظ بھی وافر تعداد میں استعمال ہوتے ہیں جیسے سنان، عنان، قطرہ، حزینہ سلاح، قلب، طرہ، مرتع، نظارہ۔ ثریا، نبات، حصار، سحاب، عقاب، برھان فلک وغیرہ وغیرہ لیکن یہ وہی الفاظ ہیں جو فارسی میں مستعمل تھے اور رواج پا چکے تھے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں عربی الفاظ سے گریز کیا ہے تو اس کے معنی صرف اتنے ہیں کہ وہ معاصر شعرا کی طرح علمیت کا رعب جمانے کے لئے عربی تراکیب و عربی الفاظ کو بروئے کار لانے کی شعوری کوشش نہیں کرتا۔

فردوسی کا ملک ایران پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ایران کی قدیم ملی روایات و داستانوں کو حوادث زمانہ سے محفوظ کر دیا۔ خود فردوسی کو اس کا احساس تھا

چو عیسیٰ من این مردگان را تمام — سراسر ہمہ زندہ کردم بنام
بسی رنج بردم در این سال سی — عجم زندہ کردم بدین پارسی

میں نے فردوسی پر اس تعارفی مضمون میں کسی ذاتی تحقیق کو نہیں پیش کیا ہے بلکہ تاریخ ادبیات ایرانی از ذبیح اللہ صفا، منتخب شاہنامہ از محمد علی فروغی و حبیب یغمائی۔ شعر العجم اور مقالات شیرانی میں جو فردوسی اور شاہنامہ سے متعلق مباحث پیش کئے گئے ہیں ان کو اپنے طور پر لکھ ڈالا ہے۔ میری حتی الامکان کوشش یہی رہی ہے کہ اس مقدمہ میں ان تمام مباحث کا احاطہ کر لیا جائے جن کا فردوسی اور شاہنامہ کے مطالعہ کے لئے ذہن میں ہونا ضروری ہے۔

ص ۱ فی الوقت چونکہ یہاں مقصد شیرانی کے مقالات پر تبصرہ کرنا نہیں ہے اس لیے اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں کہ شیرانی کے نتائج اور دلایل ان کی اپنی کاوش کا نتیجہ ہیں یا ماخوذ۔ شبہہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ بعض ایرانی اور مغربی محققین سے یہاں بھی انہیں اعتراضات کا ذکر ملتا ہے جن پر شیرانی نے اپنی تحقیق کی بنیاد قایم کی ہے نہ صرف یہ بلکہ دلایل میں بھی بسا اوقات بے حد یکسانیت ہے۔ شیرانی کے دلایل جہاں جہاں مغربی یا ایرانی محققین کے دلایل سے مختلف ہیں تو ان میں لطف کی بات یہ ہے کہ محققانہ شان کم نظر آتی ہے اور وکالت کی چال زیادہ، اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو شیرانی اور ایرانیوں کے ماخذ ایک ہی ہیں یا پھر ایک نے دوسرے سے بلا اشارہ اور حوالے کے استفادہ کیا ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ شیرانی نے ایسی اہم بحثیں کو اٹھایا۔ آج تو ہندوستان میں ہمارے فارسی کے پروفیسران صرف تقرری کی شطرنج بازیوں میں ہی منہمک ہیں یا پھر سستے اور چلتے ہوئے مضامین لکھ کر سیمیناروں میں رستم کا کردار ادا کر لیتے ہیں۔ اے کاش! ان میں کبھی سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے کی شان پیدا ہو جاتی۔ ص ۲ شاہنامہ کا عربی مترجم یہ ترجمہ ۶۲۰ھ میں ہوا تھا۔ ص ۳ اس امر کی طرف کہ سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت فردوسی اٹھاون سال کا تھا۔ شاہنامہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوں بد انگہ کہ بدسال پنجاہ دہشت	جواں بودم و چوں جوانی گذشت
روشی شنیدم زگیتی بلند	کہ اندیشہ شد پیر و من بی گزند
کہ ای نامداراں و گردن کشان	کہ جست از فریدون فرخ نشان
فریدون بے دار دل زندہ شد	زمین و زمان پیش او بندہ شد

مراد سلطان محمود (شیرانی کا یہ کہنا کہ وہ سلطان محمود کی تخت نشینی پر ۶۶ سال کا تھا میری نظر میں درست نہیں۔

ص ۴ الا ای بر آوردہ چرخ بلند | چہ داری بہ پیران مرا مستمند
چو بودم جواں برترم داشتی | بہ پیری مرا خوار بگذاشتی
بجای عنانم عصا داد سال | پراگندہ شد مال و برگشت حال

ﷺ۵ بپیچید بر خویشتن بیرنا ... کہ چوں رزم سازم برهنه تنا

زتورانیان من بدین حنجرا ... ببرم فراوان سرا نزا سرا

چو آمد به نزدیک شاه اندرا ... گو دست بسته برهنه سرا

ص۶ جب وہ ۲۵ سال کہتا ہے تو اس میں ۲۷۰ سے پہلے کا زمانہ بھی شامل کر لیتا ہے اور جب ۳۰ سال کہتا ہے تو ۳۷۰ اور اس کے بعد کا زمانہ ہے اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ داستان بیژن اور دیگر مفرد داستانیں ۳۶۵ سے ۳۷۰ تک وہ نظم کر چکا تھا تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو مقالات شیرانی

ص۷ بعض محققین یہ بات نہیں مانتے کہ محمود کی تخت نشینی سے قبل فردوسی نے شاہنامہ مکمل کر لیا تھا اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر محمود کی تخت نشینی سے قبل یہ نسخہ مکمل ہو گیا تھا تو پھر شاہنامہ کے نصف دوم میں جگہ جگہ محمود کی مدح کیوں نظر آتی ہے لیکن اس کے جواب میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ کو موجودہ ترتیب میں مکمل تو کیا نہیں کیا تھا بلکہ جس داستان پر اس کی طبیعت مایل ہوتی تھی اس کو نظم کر ڈالتا تھا۔ یہ ترتیب تو اس نے بعد میں دی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سلطان محمود کی تخت نشینی کے بعد بھی فردوسی شاہنامہ پر نظر ثانی کا کام کر رہا تھا ممکن ہے اس وقت اس نے مناسب مقامات پر محمود کی مدح شامل کر دی ہے۔ ص۸۔ اس دور کی اکثر داستانیں INDO EUROPEAN مشترک تمدن کی یاد دلاتی ہیں مثلاً زال کا ایک جانور کے دودھ سے پل کر جوان ہونا۔ پاریس پسر پریاموس یا یونانی کی داستان سے مشابہ ہے ـــــ اسفندیار کے روئیں تن ہونے کی داستان جرمنی کے زیگفرید اور یونانی آخلس سے مشابہ ہے اس طرح ہفت خوان رستم کی داستان ہرقل یونانی کی سات خوانوں کی داستان سے مشابہ ہے

Scanned by CamScanner

کشمیر ابوالفضلؒ کی نظر میں

ایک تنقیدی جائزہ

تحریر:- ڈاکٹر محمد صدیق
لیکچرار شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی سرینگر

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ترویج کا سنہری زمانہ اکبر کا زمانہ (۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ) ہے۔ اس عظیم المرتبت شہنشاہ کے زمانے میں جہاں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں وہاں علوم وفنون کے تقریباً تمام شعبوں نے بھی بے پناہ ترقی پائی۔ فارسی شعروشاعری کے میدان میں فیضی، عزالی مشہدی۔ عرفی شیرازی، عبدالرحیم خان خانان وغیرہ جیسے نامور شاعر پیدا ہوئے۔ اسی طرح اکبر کے دورِ اقتدار میں فارسی نثر میں بھی اس صدی کے ممتاز دانشور جیسے عبدالقادر بدایونی۔ ہندو شاہ فتح اللہ شیرازی وغیرہ دربار اکبری کے زینت بنے رہے۔ انہی بلند پایہ شخصیتوں میں سے ابوالفضل علامی بھی شامل ہے جس نے اپنے رشحات قلم سے اکبری دربار کو چار چاند لگائے بلکہ اکبر کا نام تاریخ ہند میں زندہ وجاوید ان رکھا ابوالفضل اور فیضی دونوں ہندوستان میں فارسی زبان وادب کو ترویج دینے کے سلسلے میں دو اہم ستون ہیں فیضی اکبر کا درباری شاعر تھا اور ابوالفضل اس کا قابل اعتماد وزیر ہونے کے علاوہ اس کا درباری مؤرخ بھی تھا۔ اس نے اکبر کے زمانے کے حالات اپنی تصنیف اکبرنامہ اور آئین اکبری میں تفصیل کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔ زیر نظر مقالے میں میں نے کشمیر کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات سے متعلق ابوالفضل کے نظریئے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

Scanned by CamScanner

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اکبر ہندوستان کا پہلا فرمانروا ہے جس نے ۹۹۴ھ میں کشمیر کو مسخر کر لیا۔ اکبر کی فتح کشمیر سے قبل اس خطے میں خود مختار مقامی مسلمان حکومت قائم تھی۔ چنانچہ کشمیر فتح ہونے کے ساتھ ہی یہاں کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور کشمیر مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ اس طرح سے مغلوں کے لئے پہلی بار فردوس روئے زمین کے دروازے کھل گئے جب انہیں اپنے آبائی وطن وسط ایشیا کی یاد ستاتی تھی تو کشمیر آکر تسکین قلب حاصل کر لیتے تھے گویا اسی لئے اکبر نے کشمیر کو خالصہ سرکار بنایا تھا اکبر ابوالفضل کے قول کے مطابق فتح کشمیر یعنی ۹۹۴ھ سے اپنی وفات یعنی ۱۰۱۴ھ تک تین مرتبہ گلشن سراے کشمیر کی سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہوا چنانچہ ابوالفضل رقمطراز ہے "و گیتی خداوند سہ بار ازین راہ بہ گلشن سرای کشمیر در آمد"۔ اکبر کے ساتھ قرابت کے پیش نظر ابوالفضل کشمیر کی مسافرت کے دوران تینوں مرتبہ اپنے آقا کے ہمرکاب تھا۔ اس طرح اسے کشمیر کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم ہوا۔ ابوالفضل نے جو کچھ بھی کشمیر میں دیکھا اور جس چیز نے اسے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس نے اس کی تصویر اکبر نامہ اور آئین اکبری میں کھینچی ہے اس نے کشمیریوں کی اجتماعی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی زندگی کے علاوہ لوگوں کے آپسی میل و ملاپ، ان کی طرز زندگی ان کے کردار و اطوار، ان کی عبادت گاہوں، زاویوں، خانقاہوں، سیر گاہوں، ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، مطربوں، موسیقاروں نیز کشمیری زبان اور اس کے ادب پاروں اور کشمیریوں کے رسومات و خرافاتی عقاید کا گہرا مطالعہ کر کے اس کی تفصیل نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج کی ہے۔

ابوالفضل نے اپنی نگارشات میں کشمیریوں کے کردار و اطوار کو ایک مشکوک انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابوالفضل جس طرح اور جیسے بھی چاہتا تھا اپنے آقا اکبر کو اطلاعات فراہم کرتا تھا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اکبر جیسے فاتح اور زبردست بادشاہ کی لشکر جرار کو دو بار کشمیری افواج کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی چنانچہ اکبر کی فوجیں اس وقت کشمیر کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو سکیں جب کشمیر میں شیعہ سنی فسادات کے پیش نظر حالات ناسازگار تھے جن سے اکبر نے پورا فایدہ اٹھایا۔ ابوالفضل جیسا چاپلوس ادیب اپنے

آقا کو خوش کرنے کیلئے جہاں جہاں کشمیریوں کے کردار کی بات چھیڑتا ہے وہاں انہیں فریب کار تصور کرتا ہے چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:۔

"کاجی چک چون رقم استقلال از جبیہ احوال مرزا حیدر خواند بمقتضای فریب و خداع کہ کشمیری ازان گریز ندارد) از کشمیر بر آمدہ پیش شیر خان رفت"[۲] اتنا ہی نہیں بلکہ ابوالفضل اس مرز و بوم کے آدمی کو سب سے بری شئے تصور کرتا ہے اور لکھتا ہے: "زبون ترین این مرز و بوم (کشمیر) آدمی ہے"[۳] لیکن تھوڑا آگے چل کر فاضل مصنف اظہار تعجب کرتا ہے کہ کشمیر میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے اور سرمایہ زندگی کی کمی کے باوجود یہاں چور اور بھیک مانگنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں۔ چنانچہ ابوالفضل رقمطراز ہے:۔

"و شگفت آن کہ باوجود بسیاری مردم و کمی سرمایۂ زندگی دزدی و دریوزہ گری کم"[۴]

ابوالفضل کا یہ بیان کس قدر مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کشمیر کی سب سے بری شئے یہاں کے لوگوں کو تصور کرتا ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ غریب اور نادار ہوتے کے باوجود یہ لوگ چوری نہیں کرتے، ہاتھ نہیں مارتے، ڈاکہ نہیں ڈالتے اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے سچائی اور حقیقت کو ابوالفضل نہیں چھپا سکا۔ سچائی خوشبو کی طرح ہے جو چھپائے نہیں چھپتی۔ دراصل یہ کشمیری عوام کی خودداری اور اس ظلم و جبر کا عکس العمل ہے جو کشمیریوں نے بالخصوص اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے ساتھ ضم ہونے کے بعد بھی نہیں گنوایا کیونکہ اکبر نے کشمیر کے بہادر لوگوں کو کسی نہ کسی بہانے چن چن کر قتل کرایا۔ اس ظلم و جبر کیخلاف کشمیریوں نے اگر کوئی ردعمل دکھایا یا غلامی میں ذلت آمیز زندگی گذارنے پر زندگی کے آخری سانس تک مغل فوجوں کے ساتھ برد آزما ہونے کو ترجیح دی تو یہ ننگ ابوالفضل جو چاہیے کہے۔ خود ابوالفضل نے کشمیری عوام پر ڈھالے جانے والے مظالم کی کہیں بھی اکبر نامہ یا آئین اکبری میں پردہ کشائی نہیں کی ہے اور کیوں نہیں کی اس پر اظہار نظر کرنا بے لاگ مورخین کا کام ہے۔

ابوالفضل کی نظر کشمیر کے شائستہ لوگ یہاں کے برہمن ہیں جن کے بارے میں وہ لکھتا

ہے کہ:۔ "انہوں نے اپنے اسلاف کی تقلید اور عادت کو ترک نہیں کیا ہے اور خدائے قادر کی عبادت بے لوث طریقے پر کرتے ہیں اس کے علاوہ اپنے مذہبی عقاید کے مخالفین کے بارے میں بدسلوکی نہیں کرتے۔ دنیوی مال و متاع کی خاطر چاپلوسی اور تگ و دو نہیں کرتے۔ ہمیشہ میوہ دار درخت لگاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی روزی کا وسیلہ بنتے ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے ہیں اور ازدواج نہیں کرتے اس طرح کے دو ہزار لوگ کشمیر میں اس وقت موجود ہوں گے۔"[5]

ابوالفضل کے اس بیان سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ برہمنوں کی بجائے ریشی مسلک کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسلمان عابدوں، زاہدوں اور صوفیوں کو کشمیر کے شائستہ کردار لوگ لکھتا ہے جو کشمیر میں عرف عام میں ریشی کہلاتے ہیں لیکن غلطی سے انہیں برہمن تصور کیا ہے کیونکہ اکبر کے زمانے میں کشمیری برہمن شادیاں بھی کرتے تھے اور ان کی تعداد دو ہزار سے کہیں زیادہ تھی بلکہ ابوالفضل ایک اور جگہ اپنے پہلے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "قوم برہمن بسیار"[6] یعنی کشمیر میں برہمنوں کی تعداد بہت ہے۔

ابوالفضل نے اوپر جو صفات برہمنوں کی بیان کی ہیں وہ درحقیقت ریشی مسلک سے وابستہ صوفیا میں پائی جاتی ہیں چنانچہ اس کی تصدیق جہانگیر کی توزک جہانگیری کے علاوہ اس کے معاصر مورخ "کامگار حسینی" کی مآثر جہانگیری سے بھی ہوتی ہے۔ دونوں کا نظریہ کشمیری ریشیوں کے بارے میں ایک ہی ہے توزک جہانگیری سے ماخوذ عبارت کے مندرجہ ذیل ترجمہ پر ذرا غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہ ابوالفضل کی عبارت کے ساتھ کس قدر مطابقت اور مماثلت رکھتی ہے۔

"کشمیر میں ایک طایفہ ایسا بھی موجود ہے جنہیں ریشی کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ علم و معرفت سے ناآشنا ہوتے ہیں لیکن خرسندی اور ظاہر آرائی کے بغیر زندگی گذارتے ہیں اور کسی بھی شخص سے بری طرح پیش نہیں آتے۔ نیازمندی کا ہاتھ کسی بھی شخص کے پاس دراز نہیں کرتے اور نہ ہی احتیاج کے لئے کسی کے آگے اظہار آرزو کرتے ہیں۔ گوشت قطعی نہیں کھاتے اور شادی بھی نہیں کرتے۔ ہمیشہ صحراؤں میں میوے دار درخت اس نیت سے لگاتے ہیں دوسرے لوگ ان سے بہرہ ور ہوں اور خود ان کے پھلوں کے متمنی

نہیں رہتے ۔ ایسے ہی تقریباً دو ہزار ریشی آج کل کشمیر میں موجود ہوں گے۔"[7]

بعض فرمانرواؤں اور اس دور کے دوسرے مورخین کی طرح ابوالفضل بھی کشمیر کو ایک دلکش ملک اور باغ ہمیشہ بہار کے ناموں سے یاد کرتا ہے جو جمال پرستوں کے لئے عشرتگاہ اور گوشہ تنہائی میں بیٹھنے والوں کے لئے ایک زاویۂ خلوت ہے۔ کشمیر کی آب و ہوا خوشگوار، پانی گوارا اور نشاط افروز اور رم جھم کرنے والے آبشار روح کو نئی تازگی اور شادابی بخشتے ہیں۔ چنانچہ ان لالہ زاروں کو دیکھ کر وہ لکھتا ہے۔ "زمین آبی وللی۔ جلگھاسی روح افزا۔ بنفشہ، گل سرخ و نرگس خودرو صحرا صحرا۔ شمارۂ گلہا اندازہ برنتابد۔ بہار و خزانش بس شگرف"[8] اسی طرح سے ابوالفضل کشمیر کے ظاہری حسن و جمال اور فطری خوبصورتی کا معترف ہے اس کے علاوہ اس نے کشمیری فن کاروں اور ہنرمندوں کی فراوانی اور ان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے فن پاروں میں سے پشمینہ کاری کے بارے میں لکھا ہے کہ پشمینہ کو دنیا کے مختلف ممالک میں بطور تحفہ و نذرانہ قبول کیا جاتا ہے۔ لکھتا ہے "گوناگون پشمینہ بشائستگی انجام گیرد۔ خاصہ شال کہ بہ ہفت کشور ارمغانی برند"[9] لیکن کشمیریوں اور خصوصاً ہنرمندوں اور فن کاروں کی قسمت میں "سوائے جامۂ تار تار" کے اور کچھ میسر اور نصیب نہیں ہوتا۔ یہاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مطلق النابیت کے دور میں کشمیریوں کی اس فلاکت اور بدحالی نے کشمیری نسل شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال کو بھی رلا دیا تھا جب انہوں نے کہا۔

کشمیری کہ بابندگی خو گرفتہ

نصیب تنش جامۂ تار تاری

ابوالفضل نے کشمیریوں کے لباس کے بارے میں لکھا ہے کہ "بیشتر پوشش پشمینہ"[10] لیکن لوگوں کی مفلسی کا یہ حال ہے کہ "یک جامہ را چند سال بکار برند"[11]۔ اس طرح سے اگرچہ ابوالفضل اکبر کے زمانے میں کشمیریوں کی زبوں حالی کو کھلم کھلا بیان نہیں کرتا لیکن اس کے قلم سے کشمیریوں کی تعریف یا ذم میں ایسے کلمات آمڈ پڑے ہیں جن سے اکبر کے

زمانے میں یہاں کے لوگوں کی حالت زار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ابوالفضل کشمیریوں کے ذوق سلیم کا صاف الفاظ میں اعتراف نہیں کرتا لیکن اس کے قلم سے بچار و ناچار کشمیریوں کی فن تعمیر کے سلسلے میں یہ الفاظ بے تحاشا نکلتے ہیں جیسا کہ جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں لکھا ہے کہ کشمیری لوگ اپنے گھروں کو خوشبودار صنوبر کی لکڑی سے اور چار طبقوں تک تعمیر کرتے ہیں۔ چھت پر مٹی ڈالتے ہیں۔ جس میں رنگ برنگ کے گل لالہ کے بیج بوتے ہیں جو ہر سال بہار کے موسم میں کھلتے رہتے ہیں اور بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ اور اپنی مہک سے فضا کو معطر بناتے ہیں۔ حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے کا یہ ذوق کشمیریوں کا خاص ذوق ہے[۱۲]۔ اور ابوالفضل اس کے بارے میں رقمطراز ہے کہ "خانہا ہمہ چوبین۔ چہار آشیانہ وافزون سازند۔ دیوار بند رسم نہ باشد۔ بر فراز سقف لالہ کارند و در بہار شگفت ستائش دہد[۱۳]۔"

ابوالفضل غالباً پہلا مغل مؤرخ ہے جس نے کشمیر کی زبان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس قوم کی ایک الگ اور جداگانہ زبان ہے جس میں یہ گفتگو کرتے ہیں البتہ اس کا یہ کہنا کہ دانش نامہ با زبان سنسکرت (دارند)[۱۴] یعنی ان کا علمی سرمایہ سنسکرت زبان میں محفوظ ہے۔ صحیح دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اکبر کے زمانے سے کوئی پونے دوسو سال پہلے کشمیر میں فارسی زبان و ادب کا رواج ہو چکا تھا۔ اس زبان نے یہاں سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانہ اقتدار (۸۲۳ھ–۸۷۴ھ / ۱۴۲۰–۱۴۷۰ء) میں سرکاری اور علمی زبان کا درجہ پایا تھا۔ سلطان موصوف کے زمانے سے اکبر کے زمانے تک ایک سو ۹۰ سال کا عرصہ گذرا۔ اس عرصہ کے دوران کشمیر نے فارسی زبان میں بڑے بڑے سربرآوردہ دانشور، قلمکار، ادیب شعرا وغیرہ پیدا کئے ہیں اور ان میں سے بیشتر ادیب دانشور اور شعرا کی تخلیقات فارسی میں ہی موجود ہیں۔ صرف اکبر کے زمانے میں ہی ہزاروں کی تعداد میں شعرا علما اور مورخین موجود تھے خود اکبر کے زمانے میں کشمیر میں تحریر کی بہاریکی معاصر فارسی تاریخ بہارستان شاہی ہے۔ مغل عہد کے معروف ترین شعرا میں شیخ یعقوب صرفی کشمیری بابا داوود خاکی، حبیب اللہ نوشہری، مظہری کشمیری۔ اوجی کشمیری، ذہنی کشمیری، میرم بزاز کشمیری وغیرہ اور ادیبوں دانشوروں اور دینی پیشواؤں میں سے بابا حیدر رتلیہ مولی، اسحق قاری

ملّا کمال الدّین کشمیری، بابا علی رینہ، ملّا محمد حسین خباز ابوالفقرا، نصیب الدّین غازی۔ ملّا جوہر ناتھ وغیرہ سب سے زیادہ مشہور ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے کے اکثر و بیشتر ادیبوں اور شعرا نے دربار اکبری میں جا کر اکبر کی مدح میں قصاید کہنا اپنے لئے عار سمجھا۔ اس عہد کے سب سے ممتاز شاعر اور دانشور شیخ یعقوب صرفی با این ہمہ کہ ان کی دربار اکبری میں آمد و رفت تھی اس نے بھی اکبر کی مدح میں قصایئد کہہ کر اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا چنانچہ صرفی خود کہتا ہے۔ ؎

بچون غنی از عالمیانم چرا | مدح سلاطین بود آئین مرا
نی بکسی مدح بگویم نہ قدح | شکر خدا فارغم از مدح و قدح[15]

ان تمام دلایل کے پیش نظر ابوالفضل کو بجائے اس کے کہ وہ " دانش نامہ با بزبان سنسکرت " لکھتا اس میں لفظ کہن کو اضافہ کر کے یوں لکھنا چاہیئے تھا کہ " دانش نامہ ہای کہن بزبان سنسکرت " تو بات بن جاتی

کشمیر میں متداول رسم الخط کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ :۔

" نیز خط جدا گانہ دارند۔ بدان کتاب ہا نویسند[16]۔ یعنی کشمیریوں کا رسم الخط بھی جدا گانہ ہے جس میں یہ کتابیں رقم کرتے ہیں۔

ابوالفضل کس خط کو کشمیریوں کے ساتھ مخصوص کرتا ہے وضاحت طلب مسئلہ ہے۔ اس زمانے میں کشمیر کا کوئی مخصوص اور جدا گانہ رسم الخط موجود نہیں تھا۔ البتہ کتب خانوں میں موجود اس زمانے میں تحریر ہو چکے مخطوطات اور قراین سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالفضل شارداخط کو غالباً کشمیر کا مخصوص رسم الخط تصور کرتا ہے۔ لیکن جیسا معلوم ہے یہ خط صرف سنسکرت کی کتابوں کے ساتھ یا زیادہ سے زیادہ کشمیری زبان کی ان کتابوں کے ساتھ جو کشمیر کے مقامی ہندوؤں نے لکھی ہیں مخصوص تھا۔ جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے یہ اس زمانے میں ایران میں متداول رسم الخط یعنی نستعلیق میں لکھی جاتی تھی۔ چنانچہ اکبر کے زمانے میں کشمیر نے عربی و فارسی کے مشہور آفاق خطاط پیدا کئے جن میں سے بعض تو دربار اکبری کی بھی زینت تھے بلکہ جہانگیر اور اکبر کے زمانے کا سب سے بڑا اور معروف خطاط جس کو اکبر نے زرین قلم کے خطاب سے نوازا تھا۔ ملا محمد حسین زرین قلم کشمیری ہے۔ ابوالفضل

Scanned by CamScanner

خود اس کے بارے میں آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "جادو رقمی کہ در ظل سریر خلافت صاحب این نقش دلپذیر (نستعلیق) توان گفت، محمد حسین کشمیر یست و بہ خطاب زرین قلمی روشناس آفاق[17]

جہانگیر توزک میں اس کے بارے میں لکھا ہے: "ملا محمد حسین کشمیری کہ سرآمد خوش نویسان زمان بود۔[18]

ابوالفضل کے دوسرے معاصر کشمیری خطاط جو اس فن میں استادی کے درجے تک پہنچے ہوئے تھے اور اکبری دربار کے ساتھ بھی وابستہ تھے۔ میں سے علی چمن کشمیری، محمد مراد شیرین قلم کشمیری اور ملا محسن کشمیری معروف ہیں۔ اس بیان سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ ابوالفضل جس خط کو کشمیریوں کا مخصوص خط تصور کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ علمی سرمایہ اسی زبان اور خط میں موجود ہے صحیح نظر نہیں آتا بلکہ اس خط میں جو کتابیں تحریر کی جاتی تھیں وہ سنسکرت یا زیادہ سے زیادہ بعض کشمیری کتابیں تھیں اور شاردا میں تحریر ہوتی تھیں لیکن تمام متداول علوم وادبیات کے لئے یہ خط مروج نہیں تھا۔

ابوالفضل کے مطابق کشمیری اولاً زیادہ تر بھوج پتر جس کے اوراق سالہا سال تک محفوظ رہ سکتے ہیں لکھتے تھے۔ اس زمانے میں ممکن ہے کہ زیادہ تر لوگ بھوج پتر پر ہی لکھتے ہوں گے لیکن ابوالفضل نے کشمیر کی کاغذ سازی کی صنعت کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ یاد رہے کہ کشمیر میں کاغذ سازی کی صنعت کا آغاز سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس عظیم المرتبت بادشاہ نے کشمیر کے بہت سے ہنرمندوں اور فن کاروں کو تربیت حاصل کرنے کی غرض سے سمرقند بھیجا۔[19] سمرقند اس زمانے میں چین کے بعد کاغذ سازی کا غالباً سب سے بڑا مرکز تھا۔ ابوالفضل نے یہاں کی مقامی کاغذ سازی کی صنعت کو نظر انداز کر کے صرف بھوج پتر کے بارے میں اپنی اطلاعات فراہم کی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس زمانے میں کشمیر میں کاغذ سازی کی صنعت میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا تھا۔ نئے قسم کا کاغذ اسی زمانے میں یا اس سے قبل کے زمانے میں کشمیر میں ایجاد ہوا تھا جس پر سے روشنائی دھونے سے بالکل ہی محو ہو جاتی تھی۔ کشمیر میں بنا ہوا یہ کاغذ دنیا کے بہت سے ممالک میں لوگ

بطور تحفہ وارمغان لے جاتے تھے۔ ابوالفضل کے معاصر کشمیری شاعر اور دانشور شیخ یعقوب صرفیؒ نے جن کے ملا عبدالقادر بدایونی سے ساتھ دوستانہ روابط قائم تھے اپنے ایک مراسلے میں بدایونی کو اس کاغذ کی خصوصیات تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

اگر حاجت بہ کاغذ کشمیری برای مسوّدات باشد۔ اعلام نمایند تا بندہ از کشمیر مسودۂ تفسیر خود فرستد کہ نقوش آن از کاغذ بشستن چنان مے رود کہ ہیچ اثری از سیاہی نماند۔ چنانچہ تجربہ کردہ باشند۔ [۲۰]

گویا اس زمانے کے کشمیری کاغذ کی نمایاں خوبی یہ تھی کہ دھونے سے اس کی ساری روشنائی بالکل محو اور صاف ہو جاتی تھی۔

ابوالفضل کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیر میں اسلام کے بارے میں اس کا نظریہ صاف نہیں وہ کشمیر میں اسلام کے پیروکاروں کو مقلد اور اسلام کو ایک تقلیدی دین تصور کرتا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ اس کی اکبر کے اختراع کئے ہوتے مذہب دین الٰہی کی طرف رغبت اور اس کی پیروی ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اکبر کے امی ہونے کے بارے میں وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ظاہری علوم کی تحصیل کے بغیر ہی اکبر تمام فیوض کا سرچشمہ تھا اور اس میں اللہ کی یہ حکمت شامل تھی کہ علماء پر ظاہر ہو جاتے کہ اکبر کی تمام عقل و دانش خداداد اور الہامی ہے [۲۱] اس طرح سے ابوالفضل نعوذ باللہ اکبر کو پیغمبروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ بہر حال ابوالفضل کے زمانے میں کشمیر کے مذہب اسلام (جس کو وہ تقلیدی دین کہتا ہے) سے وابستہ بیشتر لوگ سنی تھے جن میں بعض امامی اور کچھ نوربخشیہ مسلک کے ساتھ تعلق رکھتے تھے ابوالفضل کے زمانے میں انہیں آپس میں بڑی کشیدگی موجود تھی۔ آئین اکبری سے ماخوذ یہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"جا ماندگان چہار دیوار تقلید، بسیاری سنّی و برخی امامی و نوربخشی، "آویزۂ دشمنی میان اینان۔ بیشتر از توران و ایرانی۔ [۲۲] آئین اکبری میں ابوالفضل نے اجمالاً کشمیر کے ازمنۂ قدیم سے لیکر اکبر کے زمانے تک کے تاریخی حالات اور اہم واقعات رقم کئے ہیں۔ یہ تاریخی حالات اپنی جگہ کافی اہم

ہیں لیکن ان میں بعض جگہوں پر کافی اختلافات اور تاریخی اعتبار سے بڑی خامیاں نظر آتی ہیں مثلاً کشمیر میں سلطان شمس الدین شہمیر کی تخت نشینی کا سنہ ۷۱۵ھ درج ہے[۲۳] جبکہ ایک اور جگہ ۷۴۲ھ ثبت کیا گیا ہے[۲۴]۔ ابوالفضل نے کم و بیش تمام شہمیری بادشاہوں کی تخت نشینی کے سنوات غلط درج کئے ہیں۔ میرزا حیدر دوغلت کی پہلی بار کشمیر پر فتح کا سنہ ۹۳۰ھ درج کیا ہے[۲۵]۔ جبکہ یہ ۹۳۹ھ ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ابوالفضل نے تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ ان تاریخی خامیوں اور اختلافات سے قطع نظر کشمیر کے جغرافیائی حالات کے علاوہ لوگوں کے رہن سہن کے متعلق جو تفصیل اس عظیم المرتبت مورخ نے دی ہے اکبر کے زمانے تک ان کی طرف کسی دوسرے مورخ نے اپنی توجہ مبذول نہیں کی تھی حتیٰ کہ کشمیر کے مقامی مورخین نے بھی تاریخی حالات تحریر کرنے کے سوا دوسری اطلاعات خاص طور پر جغرافیائی حالات تحریر کرنے سے چشم پوشی کی ہے جو تاریخ نویسی کے ضمن میں ان مورخین کی ناآشنائی ظاہر کرتی ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ ابوالفضل کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کے مقابلے میں ان کی تحریریں ناقص معلوم ہوتی ہیں۔

ابوالفضل کشمیر کی بعض اہم جگہوں، عبادت گاہوں، خانقاہوں، مندروں اور لالہ زاروں کا اس طرح ذکر کرتا ہے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ شہر سرینگر کے قریب پانپور کے علاقے کا ذکر کرتے ہوئے وہ جب یہاں کے زعفران زاروں کا ذکر چھیڑتا ہے تو اس کے جزویات کی تفصیل تحریر کرنا نہیں بھولتا۔ وہ زعفران کی کاشت کا طریقہ۔ زعفران کے پھول کھلنے کے موسم اس کے اقسام اور رنگ و بو غرض اس کے ساتھ وابستہ تمام چیزوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے:۔

"در موضع پین پور از مضافات ویہی۔ دہ دوازدہ ہزار بیگہ زمین زعفران زار و نظر فریب دشوار پسندان۔ آخر ماہ فرودین و ہمگی اردی بہشت ہنگام کشت و کار آن زمین را قلبہ راندہ نرم گردانند و بکنند قطعہ زمین آمادہ کشت گردانند و پیاز ہای زعفران بسخاک درنشانند۔ بیک ماہ سبز

گردد و در آخر مہر ماہ الٰہی بکمال رسد و از یک وجب زیادہ نبالد قتلہ سفید فام باشد و چون یک انگشت یا لش نماید۔ آغاز گل کند و یکی پس از دیگری تا ہشت گل عشرت آورد و شش برگ سوسنی دارد۔ بیشتری میان شش نار۔ سہ زرد گون و سہ لعل فام۔ و زعفران عبارت از سہ پیین۔ و چون گل سپری گردد۔ سبزی بر تتہ پدید آید و از یکبار کشتن شش سال گل بر دہد۔ در سال اول کم و در دوم دہ سی آید و در سیوم بکمال رسد تا شش سال و پیاز بہم برکنند۔ اگر ہما جا نگاہ دارند پایہ پایہ کمی پذیرد لیکن بر آوردہ بہ دیگر جا بکار برند[26]۔

ابوالفضل جہاں مسلمانوں کی متبرک جگہوں، خانقاہوں اور زاویوں کا بڑی دلچسپی کے ساتھ ذکر کرتا ہے وہاں کشمیر میں رہنے والے دوسرے ادیان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی عبادت گاہوں و تیرتھوں اور مذہبی تہواروں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے پہلگام کے قریب عیش مقام کا ذکر کرتے ہوتے کہا ہے کہ یہاں ایک بلند پہاڑی پر ایک غار موجود ہے جہاں کشمیر کے ایک برگزیدہ صوفی حضرت بابا زین الدین ریشی فروکش ہو چکے تھے۔ ان کی خلوت نشینی تک یہ پہاڑی بے آب و علف تھی۔ حضرت بابا صاحب اسی غار میں زندگی کے آخری ایام تک مصروف عبادت تھے۔ آخر کار غار کو ایک بڑے پتھر سے بند کر دیا اور خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے۔

"در موضع اش خلوت کدۂ بابا زین الدین ریشی است۔ در کمر کوہ واقع گویند در باستانی زمان این کوہ آب نداشت۔ چون نشیمن ایشان شد چشمۂ تراوش نمود۔ دوازدہ سال درین خلوت کدہ بودند۔ آخر گران سنگی بہ در غاری نہادہ بیرون نیامدند و ہیچ کس نشان نیافت[27]۔

کشمیر کے سربرآوردہ اس صوفی اور عارف کے متعلق یہ اطلاعات درج کرنے کے بعد ابوالفضل پہلگام سے آگے بلند و بالا پہاڑیوں میں ہندوؤں کی ایک متبرک تیرتھ امرناتھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں ایک غار میں برف سے مہادیو کا پیکر بنتا ہے۔ اس کی تفصیل ابوالفضل یوں درج کرتا ہے۔

Scanned by CamScanner

”در میان ننبت کلان و پرگنۂ مذکور غاریست و دران از سنگ پیکری است ۔ امرناتھ نام بزرگ پرستش جا انگارند ۔ چون ماہ از تحت الشعاع برآید ۔ درآن غار حباب واری از سنگ پدید آید و ہر روز قدری افزاید تا پانزدہ روز و زیادہ بہ دو گز الٰہی رسد ۔ و چوں ماہ بکی گراید آن صورت نیز کاستن گیرد ۔ چنانچہ انجام ماہ اثری نماند پیکر مہادیو انگارند و برآمد کار ہارا دستمایہ دانند ۔“ [۲۸]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے کشمیر کے عام لوگوں کا رہن سہن ان کے آپسی طور طریق، ان کا میل و ملاپ، اٹھنا بیٹھنا، کھانے پینے کے آداب غرض ہر چیز کا بغور جایزہ لیکر اس کو اجمالاً آئینِ اکبری میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قلمبند کیا ہے ۔ کشمیر میں سخت موسم سرما اور برفباری کی وجہ سے سبزیوں کی کم فراہمی کے پیش نظر لوگ موسم خزاں میں ہی سرما کے لئے سبزیاں خشک کر کے رکھ لیتے ہیں اور یہ رسم آج بھی موجود ہے ۔ ابوالفضل جہاں کشمیریوں کے بارے میں یہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ چاول کھانے کے عادی ہیں اور صبح کا پکایا ہوا چاول شام کے لئے بھی رکھ لیتے ہیں اور یہ رسم آج بھی موجود ہے ۔ ابوالفضل جہاں کشمیریوں کے بارے میں یہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ چاول کھانے کے عادی ہیں اور صبح کا پکایا ہوا چاول شام کے لئے بھی رکھ لیتے ہیں وہاں یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ یہ لوگ سبزیاں خشک کر کے رکھ لیتے ہیں ۔ آئینِ اکبری کی فارسی عبارت ملاحظہ ہو :-

”بیشتر خورش برنج و شراب و ماہی و گوناگون سبزی، پیشین خشک کردہ نگاہدارند ۔ برنج پختہ را شب گذارندہ بخورند ۔“ [۲۹]

جہاں تک علم و دانش میں کشمیریوں کی مہارت کا تعلق ہے ابوالفضل کے بقول اکبر کے زمانے میں یہاں کے علماء اور دانشوروں کو علوم متداولہ میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اتنا ہی نہیں بلکہ طب اور نجوم کے میدان میں کشمیر کے دانشور ہندوستانی اطبا اور منجمین کے ساتھ مطابقت اور مماثلت رکھتے تھے ۔ [۳۰]

وسایل حمل و نقل کے بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ بوجھ کشتیوں پر لادا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہاں کے لوگ اپنی کمر پر بوجھ اٹھا لیتے ہیں اور میلوں اور فرسنگوں کا راستہ پیدل طے کر لیتے ہیں

Scanned by CamScanner

"مدار بارکشی بر کشتی و آدم گران بار ہا بر پشت کرہ کوہ نوردی نمایند۔ ملاح و درود گر را دکان بس گرم[۳۱]۔"

ابوالفضل کے زمانے میں کشمیر میں گویئے اور موسیقار بڑی تعداد میں موجود تھے ان کی رس بھری آواز دل پرستر کا کام کرتی لیکن ابوالفضل کے بیان کے مطابق یہ ایک ہی آہنگ میں ایک نواخت / گاتے تھے لکھا ہے:

"خنیاگران فراوان لیکن بیک آہنگ سرایند و با ہر یک نالہ الیست کہ ناخن بر جگر زند[۳۲]۔"

بہر حال کشمیر کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات سے متعلق ابوالفضل نے آئین اکبری اور اکبر نامہ میں متعدد جگہوں پر بڑے دلچسپ اطلاعات یکجا کر کے فراہم کی ہیں اگر چہ ان میں سے بعض اطلاعات تاریخی صداقت کی محتاج ہیں لیکن ان میں سے اکثر اطلاعات ایسی ہیں جو صرف ابوالفضل کی تاریخ سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں بلکہ کسی دوسرے ذرایع سے نہیں۔ اگر بالفرض ابوالفضل نے اکبر نامہ اور آئین اکبری جیسی گران قدر تصنیف میں کشمیر سے متعلق یہ حالات تحریر نہ کئے ہوتے تو آج ہم بے شک ان بیش بہا اطلاعات سے محروم رہتے۔

حوالہ جات

۱۔ آئین اکبری ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین احمد ص ۶۳۔

۲۔ اکبر نامہ ۱/۱۹۷ (فارسی)۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

۳۔ آئین اکبری ۲/ ۵۶۲ (فارسی)۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

۴۔ آئین اکبری ۲/ ۵۶۲۔

۵۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین احمد ص ۶۴۔

۶۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین احمد ص ۶۴۔

۷۔ توزک جہانگیری ص ۳۰۶ نولکشور ماثر جہانگیری ص ۱۳۰ میں بھی کم و بیش یہی عبارت درج ہے۔

۸۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین ص ۶۳۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین ص ۶۲۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ توزک جہانگیر۔ مآثر جہانگیری از کامگار حسینی ص ۲۹۸۔

۱۳۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین ص ۶۲۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ مسلک الاخیار از مرفی (قلمی) کتب خانہ مخطوطات کشمیر یونیورسٹی شمارہ ۱۳ ص ۵۲۔

۱۶۔ انتخاب از آئین اکبری ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین ص ۶۳۔

۱۷۔ آئین اکبری ۱/ ۱۱۵

Scanned by CamScanner

۱۸۔ توزک جہانگیری ص ۴۵ (نولکشور)

۱۹۔ بہارستان شاہی مصنف نامعلوم مخطوط ص ۴۵ کتب خانہ مخطوطات کشمیر یونیورسٹی
تاریخ کشمیر از سید علی مخطوط برگ ۵ اب کتب خانہ مخطوطات کشمیر یونیورسٹی۔

۲۰۔ منتخب التواریخ از ملا عبدالقادر بدایونی ۳/۱۴۴۔ مطبوعہ ۶۹-۱۸۶۸ء کلکتہ

۲۱۔ اکبر نامہ ۱/۲۷۰۔

۲۲۔ آئین اکبری ۲/۵۶۳۔

۲۳۔ آئین اکبری ۲/۳۷۹ (انگریزی ترجمہ) ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۷۲ء دہلی

۲۴۔ ایضاً ۲/۳۸۶ (انگریزی ترجمہ)

۲۵۔ ایضاً ۲/۳۹۰

۲۶۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین ص ۶۵۔۶۶

۲۷۔ ایضاً ص ۶۷

۲۸۔ انتخاب از آئین اکبری۔ ارمغان ہند از ڈاکٹر شمس الدین احمد ص ۶۷

۲۹۔ انتخاب از آئین اکبری ارمغان ہند ص ۶۳

۳۰۔ ایضاً ۶۴۔

۳۱۔ ایضاً ۶۴۔

۳۲۔ انتخاب از آئین اکبری ارمغان ہند ص ۶۴۔

Scanned by CamScanner